رسائل و مسائل

انکارِ حدیث اور اقرارِ حدیث

سوال: رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے اسوۂ حسنہ کا جو تفصیلی ریکارڈ حدیث کی کتابوں میں موجود ہے اُس کی افادیت و اہمیت کا منکر کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے استفادہ کرنے کے بجائے اس پورے ذخیرے کو دریا بُرد کر دیا جائے۔ البتہ بعض حضرات اپنا مسلک یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم صرف انہی حدیثوں کو مانتے ہیں جو صحیح ہیں اور حدیث کی صحت کا معیار ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ خلافِ قرآن اور خلافِ عقل نہ ہو۔ ان حضرات کا کہنا یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حیثیت سے رسول اللہ تھے اور دوسری حیثیت سے امیرِ ملت اور مرکزِ ملت تھے۔ رسول اللہ ہونے کی حیثیت سے آنحضورؐ کا جو اسوہ دائماً واجب الاتباع ہے وہ قرآن کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے اور سنت کا اطلاق اگر کسی شے پر کرنا بھی ہو تو وہ اسی قرآنی اسوۂ رسول پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ماسوا آپ کا جو قول و فعل منقول ہے اُس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ امیرِ ملت اور خلیفۂ وقت کے قول و فعل کی سی ہے۔ امیرِ ملت ہونے کی حیثیت میں آپ کے اوامر و نواہی صرف حینِ حیات آپ کے مامورین (صحابہ کرام) کے لیے واجب الاتباع تھے۔ بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و قضایا کی حیثیت محض ایسے تاریخی نظائر کی ہے، جن کی پابندی اور اطاعت لازم نہیں ہے۔ اصل اور مطلوب اطاعت صرف قرآنی حکومت کے موجود اور حاضر امراء کی ہے اور ان امراء کو یہ حق حاصل ہے کہ چاہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی پیروی کریں اور کرائیں اور چاہیں تو ان میں ردّ و بدل کر کے نئے احکام وضع کریں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قول و عمل کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اُس کے صرف عہد نبوی ہی تک واجب الاطاعت ہونے کے حق میں یہ اصحاب مختلف دلائل پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی بشری اور نبوی حیثیتوں میں امتیاز قائم کر کے ارشاد فرمایا تھا کہ بشری حیثیت میں جو اعمال آپ سے ظہور پذیر ہوں ان کی اطاعت لازم نہیں۔ خلفائے راشدین نے بہت سے معاملات میں معمولات نبوی کے خلاف عمل کیا ہے، بالخصوص حضرت عمرؓ نے تو چالیس پچاس فیصلے ایسے نافذ کیے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیے تھے۔ امام ابو حنیفہ کا مسلک بھی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا بلکہ صحیح احادیث بھی اگر ان کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو وہ انہیں منسوخ اور ناقابلِ عمل قرار دے کر رد کر دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ احکام عہد نبوی میں قوم عرب کیلیے خاص تھے، دوسروں پر ان کی من و عن تعمیل واجب نہیں ہے۔ یہی نظریہ شاہ ولی اللہ کی جانب بھی منسوب کیا گیا ہے۔

قرآنی فکر کے پیامبروں اور علمبرداروں کا مسلک تو میں نے مختصراً بیان کر دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مسلک کو انکارِ حدیث و سنت پر محمول کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور احکام رسول کو صرف عہدِ رسالت تک واجب الاتباع سمجھنے کا نظریہ اور اس نظریے کا انتساب مذکورہ بالا سلف صالحین کی طرف صحیح ہے یا نہیں؟

جواب :- آپ نے اپنے خط میں جن سوالات کو چھیڑا ہے ان پر مکمل اور تفصیلی بحث ایک مختصر جواب کی شکل میں نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے تو ایک طویل مضمون، بلکہ ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ الحمدللہ کہ ذی علم اصحاب نے اپنے مستقل مضامین اور تصانیف میں اس ضرورت کو بہت بڑی حد تک پورا بھی کر دیا ہے۔ اس لیے میں صرف یہ کوشش کروں گا کہ آپ کے خط کو سامنے رکھ کر اس سلسلے کی چند اصولی باتیں عرض کر دوں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ اس مسلک کے قائل ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو قولی اور عملی تعلیمات قرآن سے زائد ہیں ان کی پیروی صرف آپ کی زندگی میں صحابہ کرام پر لازم تھی، ان لوگوں کا اقرارِ حدیث اور انکارِ حدیث برابر ہے۔ یہ لوگ اپنے قائم کردہ معیارات پر جانچ کر اگر کسی حدیث کو صحیح اور قرآن و عقل

کے مطابق قرار دے بھی لیں تو اس کا عملی نتیجہ صرف یہ برآمد ہوگا کہ وہ اس حدیث کو بس صحیح مان کر رہ جائیں گے اور اس بات کو بطور ایک امر واقع کے تسلیم کر کے بیٹھ جائیں گے کہ فلاں بات کی نسبت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب درست ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح مثلاً ایک شخص بطور امر واقع کے مان لے کہ کتاب "سرمایہ" کارل مارکس کی تصنیف ہے یا "ارمغانِ حجاز" کلامِ اقبال ہے۔ باقی رہا ایک شے کو صحیح مان لینے کے بعد اس پر عمل پیرا ہونے کا سوال تو وہ وہاں بھی خارج از بحث ہوگا اور یہاں بھی۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ جس مقام تک یہ حضرات جا سکتے ہیں وہ یہ کہ "مرکزِ ملت" اگر اس حدیث کو قابلِ عمل سمجھ کر اس پر عمل کرانے کا فیصلہ صادر فرمادے تو اس پر عمل بھی کر لیں گے۔ مگر ایسی حالت میں بھی حدیث پر عامل ہونے کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ یہ قولِ رسولؐ یا عملِ رسولؐ ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہوگی کہ "مرکزِ ملت" نے اسے پاس کر کے سندِ جواز عطا کر دی ہے۔ اگر "مرکزِ ملت" اس حدیث پر خطِ ترمیم یا خطِ تنسیخ پھیر دے تو پھر یہ حضرات بیش از بیش جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ حدیث صحیح کو بھی ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کر کے اسی جگہ رکھ دیں گے جہاں تاریخ کے دوسرے ذخیرے رکھے ہیں۔ تاریخ نہ سکندر اور نپولین کی واجب الاتباع ہے نہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی!

میرا خیال یہ ہے کہ اس مسلکِ شریف کے حاملین کے لیے یہ ایک غیر ضروری تکلف ہے کہ وہ حدیث کی صحت اور عدمِ صحت کے لیے نقلی یا عقلی کسوٹیاں فراہم کرنے کرانے کے جھنجھٹ میں پڑیں۔ انہیں تو جم کر ایک ہی موقف اختیار کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ جس حدیث پر "قرآنی حکومت" اپنی مہرِ تصدیق ثبت کر دیگی اس کا چلن ہوگا اور جس حدیث کو وہ اپنے عہد کے حالات اور مصالح کے لحاظ سے ناقابلِ عمل قرار دے دیگی وہ کھوٹے سکّے کی طرح کسال باہر ٹھہرادی جائیگی۔ البتہ اگر منشا یہ ہو کہ انکارِ حدیث کے سنگین الزام اور عامۃ المسلمین کی ناراضی سے بچنے کے لئے نیمے دروں نیمے بروں کی پالیسی اختیار کی جائے اور خلطِ مبحث سے کام لے کر زبان سے حدیث کے اقرار اور عمل سے اس کے انکار کا موقف لیا جائے تو بات دوسری ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی اور آپ کے فرامین و قضایا اور آپ کی قولی و عملی ہدایات

صرف عہدِ نبوی تک واجب الاطاعت قرار دینے کے لیے ان اصحاب کی طرف سے رسالت اور امارت کے مابین جس طرح تفریق قائم کی گئی ہے یہ بھی ایک خواہ مخواہ کی مغالطہ آمیزی ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے امیر بھی تھے، قاضی بھی تھے، سپہ سالار بھی تھے اور متعدد دیگر حیثیات میں بھی آپ مومنین کے ہادی اور رہنما تھے لیکن ذاتِ نبوی کی یہ تمام حیثیتیں درحقیقت منصبِ رسالت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے منفک کرنے اور ایک کو دائمی اور دوسری کو عارضی قرار دینے کا نظریہ اور خیال سراسر باطل اور غیر معقول ہے۔ مقامِ رسالت کا ظہور انہی مختلف حیثیات کے پردے میں ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اندر رسالت کی شان لیے ہوئے ہے اور ہر ایک پر مشکوٰۃ نبوت کے نور کا پرتو پڑا ہوا ہے۔ ان سے الگ کر کے نبوت و رسالت کی حقیقت و ماہیت کا تصور کرنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام مختلف حیثیتوں سے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں وہ دراصل فریضۂ رسالت ہی کی ادائیگی کی متعدد صورتیں ہیں۔ ان سب کا باہمدگر پیوستہ ذکر بلا امتیاز قرآن میں بھی موجود ہے اور حدیث میں بھی۔ وہاں نہ تو رسالت و امارت کے مابین کوئی خطِ فاصل کھینچا گیا ہے نہ یہ اصول کہیں بیان کیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قول و فعل قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے بس وہی اسوۂ حسنہ اور سنتِ رسول ہے اور وہی دائماً واجب الاتباع ہے اور قرآن سے باہر اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کی کوئی روداد موجود ہو تو اُس پر اسوۂ حسنہ اور سنتِ رسول کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ بس ایک امیر کا قول و فعل ہے جو عہدِ امارت کے ختم ہو جانے کے بعد قابلِ تقلید نہیں ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اگر صرف قرآن ہی کو سامنے رکھ لیا جائے تو اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے متعدد پہلو ایسے مذکور ہیں جن کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شعبۂ امارت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اب اگر امارتِ نبوی کے حقوق و واجبات کو منصبِ رسالت سے ممیز کر کے انہیں عارضی اور وقتی قرار دے دیا جائے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ امارت سے متعلق قرآنی اسوۂ حسنہ بھی ابداً قابلِ تقلید نہیں ہے، حالانکہ یہ بات بالکل باطل، لغو اور خود قرآن کی تصریحات کے خلاف ہے۔ یہ ان مدعیانِ تفریق و امتیاز کے اُس نظریے کے بھی خلاف ہے جس کے

لحاظ سے وہ ازراہ کرم قرآن کے اندر جذب شدہ اسوۂ نبوی کو سنتِ رسولؐ کا درجہ دے کر اسے اپنے لیے قابلِ اتباع قرار دیتے ہیں۔

اب ان مزید دلائل کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جن پر امارت و رسالت کی تفریق کی بنا رکھی گئی ہے ان میں سے ایک دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ بشری اور نبوی حیثیتوں کے درمیان امتیاز کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بعض امور میں اپنی پیروی سے مستثنیٰ کر کے ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ کم از کم اس سلسلے کی بعض احادیث کو صحیح مان کر ان سے "استفادے" کی سعی کی گئی ہے۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ان احادیث سے اس نظریے کے حق میں کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جس کی بنا پر امارت و رسالت کے مابین تفریق کر کے ایک کو عارضی اور دوسری کو دائمی قرار دیا گیا ہے؟ کیا آنحضورؐ کے بشری خصائص اور فریضۂ ہدایت و امامت کی انجام دہی کے دوران نافذ شدہ احکام و ارشادات کی نوعیت بالکل یکساں ہے؟ بلاشبہ بعض ایسے خصائص بشریہ یا امورِ عادیہ کا صدور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہوا ہے جن کی پیروی شریعت نے ہم پر لازم قرار نہیں دی لیکن کیا کوئی ہوش مند اور انصاف پسند مسلمان اس استثناء سے یہ کلیہ اخذ کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ہادی، معلم، مربی اور حاکم ہونے کی حیثیت سے عمر بھر جو کارنامہ انجام دیا اس کی پیروی سے بھی ہم آزاد ہیں، حالانکہ اس کی پیروی اور اقتداء کا واضح حکم نہ صرف صحابہ کرام کو بلکہ صراحت کے ساتھ ان سے بعد میں آنے والوں کو بھی دیا گیا۔[1]

احکامِ نبوی کو عارضی اور ہنگامی ثابت کرنے کے لیے ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ خلفائے راشدین نے بہت سے معاملات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عمل کیا ہے اور اس بارے میں

---

[1] اس نوعیت کے احکام پر مشتمل احادیث بکثرت موجود ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ ستکون من بعدی کذا وکذا (تم میرے بعد ایسے اور ایسے حالات سے دوچار ہو گے، تو تم ایسا اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا)۔ یہ احادیث انہی کتابوں میں موجود ہیں جن میں سے بشری اور نبوی حیثیتوں سے متعلق احادیث پیش کی جاتی ہیں۔ نہ معلوم اس طرح کی احادیث کی اہمیت و افادیت کے بارے میں کیا رائے ہے؟

حضرت عمرؓ کا حوالہ خاص طور پر دیا گیا ہے۔ مجھے یہاں بھی افسوس کے ساتھ یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ الزام عائد کرتے وقت پھر وہی حرکت کی گئی ہے کہ واقعات کی غلط اور یک رخی تصویر پیش کر کے جس چیز کو استثناء کا درجہ بھی مشکل سے دیا جاسکتا تھا، اُسے قاعدۂ کلیہ کی شکل میں نمایاں کر کے دکھا دیا گیا ہے۔ بعض اصحاب علم نے ایسے تمام واقعات کا استقصاء کر کے اور ان کی تفصیلات بیان کر کے اس الزام کی قلعی اچھی طرح کھول دی ہے اور اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ خلفائے راشدین نے سنت رسول سے سرِمو تجاوز نہیں کیا۔ جن امور کو حضرت عمرؓ یا دیگر خلفائے راشدین کی جدت یا اولیات میں سے شمار کیا گیا ہے، اُن کے بارے میں یا تو کتاب و سنت سے کوئی نص موجود نہ تھی یا اگر تھی تو اس میں اتنی وسعت موجود تھی کہ اُس کی تعمیل میں ایک سے زائد صورتیں اختیار کی جاسکتی تھیں۔

ان واقعات کی صحیح تفصیلات و توجیہات بیان کرنے کے بجائے میں چاہتا ہوں کہ آپ قرآنی فکر کے پیامبروں سے یہ پوچھیں کہ خلفائے راشدین کی ان مزعومہ ترمیمات کی تلاش میں وہ جن کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے ہیں کیا وہاں اس قسم کی روایات بھی ان کی نگاہ سے کبھی گزری ہیں یا نہیں کہ یہی خلفائے راشدین انعقادِ بیعت کے وقت یہ عہد کیا کرتے تھے کہ ہم ہمیشہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے تمسک کریں گے اور خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد ان میں سے ہر ایک نے مجمع عام میں مسلمانوں سے یہ کہا تھا کہ اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم۔ (میری اطاعت اُس وقت تک کرو جب تک میں اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کروں اور جب میں اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر واجب نہیں ہے)۔ ان خلفاء کے سامنے جب بھی کوئی فیصلہ طلب معاملہ آتا تھا تو وہ سب سے پہلے کتاب اللہ اور اس کے بعد اپنے علم کی حد تک سنتِ رسول اللہ سے رجوع کرتے تھے۔ اگر ذاتی علم رہنمائی نہیں کرتا تھا تو پھر ارباب شوریٰ سے پوچھا جاتا تھا کہ آیا ان کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد ایسا ہے جو اس مسئلے کو حل کر سکے۔ اگر وہاں سے بھی مدد نہیں ملتی تھی تو پھر عام منادی کی جاتی تھی کہ فلاں قضیہ درپیش ہے، کیا اس سے متعلق کسی کے پاس سنت کا کوئی علم موجود ہے؟ اگر کسی کے ہاں فرمانِ رسول مل جاتا تھا تو خلیفہ بے اختیار پکار اٹھتا تھا

کہ الحمد للہ الذی جعل فینا من یحفظ علینا دیننا (خدا کا شکر ہے کہ جس نے ہمارے درمیان ایسا آدمی پیدا کیا ہے جو علوم نبوی کی محافظت کرتا ہے)۔ اس کے ساتھ ہی خلیفہ راشد حسرت بھرے لہجے میں اپنی لاعلمی پر افسوس کرتے تھے اور فرماتے تھے الھانی الصفق بالاسواق (مجھے بازار کے کاروبار نے غافل رکھا!)۔ بلکہ اگر خلیفۂ وقت کوئی فیصلہ کر بیٹھتے تھے اور بعد میں اس کے خلاف سنتِ رسول سے کوئی شے علم میں آجاتی تھی تو فوراً اپنے فیصلے سے رجوع کر کے خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ وہ نادانستہ بھی سنت کی خلاف ورزی سے بال بال بچ گئے۔ وُلاۃ اور قضاۃ اور معلمین کو یہ واضح ہدایت دے کر مامور کیا جاتا تھا کہ پہلے کتاب و سنت سے مراجعت کرو، اگر وہاں سے نص نہ ملے تو پھر اجتہاد کرو۔

اس طرح کی روایات حدیث، سیرت اور تاریخ کی تمام کتابوں میں بکثرت موجود ہیں اور ایک ایک کتاب میں کئی کئی مرتبہ دہرائی گئی ہیں۔ ان سے منہ موڑ کر اگر کوئی شخص محض اپنے مفید مطلب استثنائی واقعات کو چنتا پھرے تو اس کی مثال بالکل اُس شخص کی سی ہے جو روز روشن میں نظر آنے والے اور شاہراہِ عام پر نصب کردہ سنگ ہائے میل سے تو آنکھیں میچ لے لیکن تنگ و تاریک کوٹھریوں میں تنکے تلاش کرتا پھرے۔ حق کے طالب گاروں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا کہ پہلے خود اپنی مرضی سے ایک نظریہ گھڑیں پھر اس کی موافقت میں کہیں سے اگر رائی کا ایک دانہ بھی مل جائے تو اسے پہاڑ بنا کر دکھائیں اور اپنے منشا کے خلاف اگر پہاڑ بھی نظر آئے تو اُس کے وجود ہی کا انکار کر دیں۔ جن لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ قرآن کی سند کے بغیر لقمہ توڑنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے انہیں اپنے دعوے کی کچھ تو لاج رکھنی چاہیے!

بہر کیف جو شخص واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے مرض میں مبتلا نہ ہو وہ خلفائے راشدین کی سیرتوں کو دیکھ کر کبھی یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا کہ یہ خلفاء اپنے آپ کو سنتِ رسول کی پیروی سے آزاد یا اس کی خلاف ورزی کا مجاز سمجھتے تھے۔ یہ الزام حضرت عمرؓ کے خلاف خاص طور پر عائد کیا جاتا ہے اور اُن کے چالیس یا پچاس فیصلے اس کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ عہدِ فاروقی کی میعاد تقریباً ساڑھے دس برس تھی اور اس مدت میں حضرت عمرؓ نے بلا مبالغہ سینکڑوں نہیں، ہزاروں ہی معاملات میں اپنے

لہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

فیصلے صادر فرمائے ہونگے۔ ان میں سے صرف چالیس یا پچاس معاملات ایسے نکلنا جن کے اندر سنتِ نبوی سے بادی النظر میں عدمِ مطابقت دکھائی جاسکے، اوّل تو بجائے خود اس الزام کی کمزوری پر کھلی دلیل ہے، پھر جب آدمی یہ دیکھتا ہے کہ ان مثالوں میں بھی اپنا مدّعا ثابت کرنے کے لیے کیسی کچھ کھینچ تان کی گئی ہے اور جان بوجھ کر اپنی طرف سے جھوٹ ملاکر یا واقعات کی تحریف کرکے زبردستی اتباعِ سنت کو خلاف ورزیِ سنت بنایا گیا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ "قرآنی فکر" کے ان علم برداروں کی دیانت پر گھن آنے لگتی ہے۔ میں یہاں صرف ایک مثال بطورِ نمونہ ذکر کیے دیتا ہوں حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے طواف میں کندھا ہلاکر دوڑنا ضروری قرار نہیں دیا تھا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اظہارِ شوکت اور کفار کو مرعوب کرنے کی خاطر ایسا کیا تھا اور غلبۂ اسلام کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اب دیکھیے۔ صحیح احادیث میں جو واقعہ مذکور ہے وہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے رَمل (کندھے ہلاکر دوڑنے) کو ترک کرنے کا ارادہ تو کیا تھا کیونکہ بظاہر اس کی ضرورت اب باقی نہیں رہی تھی مگر معاً بعد آپ کے ذہن میں دوسرا خیال پیدا ہوا اور آپ نے فرمایا: شَیْءٌ صنعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا نحب ان نترکہ (یہ تو ایسا کام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ پس ہمیں اس کا چھوڑنا پسند نہیں)۔ بخاری، کتاب المناسک میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ، جنہیں بڑی دھوم دھام سے منکرِ حدیث بنایا جاتا ہے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں — اور یہ وہی کتاب ہے جس سے انکارِ حدیث کی سند فراہم کی جاتی ہے — اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ترکِ رَمل کا ارادہ کیا تھا کیونکہ اس کی علت اب موجود نہ تھی، ثم خشی عمر ان یکون لہ سبب اٰخر، "پھر عمرؓ ڈر گئے کہ کندھا ہلاکر دوڑنے کا سبب کوئی دوسرا نہ ہو جو اُن پر مخفی ہو"۔

سبحان اللہ! جو عمرؓ سنت کے معاملے میں اتنے محتاط اور چوکنّے تھے کہ دوڑتے ہوئے شانے کی ایک مخصوص حرکت کو بھی تبدیل کرنے سے خائف تھے کہ مبادا شارع علیہ السلام کی مخالفت لازم نہ آئے، اُن کے خلاف سنت کے ترک اور سنت میں ترمیم و تنسیخ کا الزام عائد کیا

جاتا ہے[1]!

حضرت عمرؓ اور دیگر خلفائے راشدین کے بعد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر ترکِ سنّت اور انکارِ حدیث کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے، اُس کا حال بھی یہی ہے۔ حقیقت و صداقت سے اس کا دُور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اس الزام کی بھی علماء کی جانب سے مفصل تردید کی جاچکی ہے۔ میں اس بارے میں صرف یہ عرض کرونگا کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ کے سلسلے میں جو خدمات سرانجام دی ہیں اور حدیث و سنت کے بارے میں ان کا جو موقف تھا، وہ کوئی تاریخ کا گم شدہ ورق نہیں ہے کہ مؤرخین کی تاریخوں یا شعراء کے خطبات میں اس کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے۔ علاوہ ازیں کسی شخص کا مسلک معلوم کرنے کا یہ کوئی صحیح اور معقول طریقہ نہیں ہے کہ وہ شخص خود اور اس کے تلامذہ اور موئدین جس طرح اُسے پیش کرتے ہیں اُس سے اعراض کر کے اُس شخص کا مسلک اُن لوگوں سے معلوم کیا جائے جو اس سے مخالفت یا اختلاف کا جذبہ رکھتے ہیں یا اُس کے مسلک کی کما حقہٗ واقفیت بھی نہیں رکھتے۔ اس میں شک نہیں کہ امام صاحب کے اجتہادات کے ضمن میں حدیث کے ضعف و قوت اور حدیث و قیاس کی کثرت و قلت سے متعلق علمی بحثیں پہلے بھی چلتی رہی ہیں اور شاید آئندہ بھی چلتی رہیں گی لیکن آپ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اگر انصاف سے کام لے تو اُن پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ منکرِ حدیث تھے اور صحیح حدیث کو یہ کہہ کر رد کر دیتے تھے کہ اس پر عمل کرنے کا زمانہ اب بیت گیا۔ جس امام کے اقوال یہ ہوں کہ " اذا صح الحدیث فھو مذھبی[2]"۔ . . " لولا السنۃ ما فھم احد منا القرآن[3]"۔ . . . . " لولا الحدیث لقلت بالقیاس[4]"۔ اور جو امام دیگر

---

[1] ممکن ہے حضرت عمرؓ سے انتقام لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ انہوں نے فتنۂ انکارِ سنت کے خلاف پہلے سے خصوصی طور پر متنبہ فرما دیا تھا۔ چنانچہ سننِ دارمی کی ایک روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے فرمایا آئندہ کچھ لوگ پیدا ہونگے جو قرآن میں شبہات پیدا کر کے بحثیں کریں گے فخذوھم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ" ان جھگڑالو لوگوں پر سنت کے ذریعے سے گرفت کرو کیونکہ اصحابِ سُنن ہی کتاب اللہ کا بہتر علم رکھتے ہیں"۔ [2] جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ [3] اگر سنت نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی قرآن کا فہم حاصل نہ کر سکتا۔ [4] اگر حدیث نہ ہوتی تب میں قیاس سے کام لیتا۔

مذاہب فقہیہ کے برعکس اور قیاس کے بالکل خلاف، نماز کے اندر قہقہہ کو محض اس وجہ سے مفسد وضوء و صلوٰۃ قرار دیتا ہو کہ حدیث میں ایسا ہی وارد ہے، اور جس امام کے مقلدین کا یہ حال ہو کہ وہ اپنی تحقیق و تدقیق کا پورا زور اس امر پر صرف کرتے ہوں کہ ہمارے مسلک کے ایک ایک جزئیے کے حق میں دوسرے مذاہب کے بالمقابل اگر قوی تر حدیث نہیں تو کم از کم برابر کی قوی حدیث تو ضرور موجود ہے، اور جو قیاس پر ضعیف حدیث کو بھی ترجیح دینے کے قائل ہوں، ایسے امام کے خلاف انکارِ حدیث کا الزام جڑ دینا ظلمِ عظیم نہیں تو اور کیا ہے؟

(غلام علی)